© rasailojaraid.com

— شباب ونہاروی
لائبریرین دار السلام لائبریری باغ جناح، لاہور

اقبالؒ بحیثیت تعلیمی مفکر

ارسطو اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "رسالہ سیاسیات" کی فصل ہفتم میں تعلیم وفن پر تفصیلی مگر سطحی بحث کرتے ہوئے یہ اشارہ کرتا ہے کہ فن کی تحصیل کا کوئی نصب العین ہوتا ہے۔ بعینہٖ تعلیم بھی مثل فن کے ہے، جس کا منتہائے مقصود عوامی فلاح اور معاشرتی بہبود ہوتا ہے۔ تعلیم کا یہ ہمہ گیر تہذیبی تصور کسی قوم کے مخصوص مزاج اور ماحول کے تقاضوں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ہر قوم کے فلسفہ تمدن وثقافت میں تعلیمی پالیسی اس ملک کے جذبۂ حب الوطنی، سماجی وثقافتی روایات اور معاشی مقاصد کو مدِ نظر رکھ کر مرتب کی جاتی ہے۔

اقبالؒ نے بھی برصغیر پاک وہند کے عوام اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے ایک مؤثر اور بہتر نظامِ تعلیم کی ضرورت کا شدت سے احساس کیا جو نئی نسل کے اندر علمی بیداری کے ساتھ ساتھ ان میں خود اعتمادی، سائنٹفک تحقیق وجستجو کا جذبہ، انقلاب وارتقا کی تڑپ اور تصرف وتسخیر کا شعور ابھارنے نیز مسائلِ حیات کے تقاضوں کو سلجھانے اور حل کرنے میں پوری پوری رہنمائی کر سکے۔

مفکرِ مشرق کی چشمِ بصیرت نے ایک طرف تو سترھویں صدی کے صنعتی انقلاب کا تحقیقی جائزہ لیا۔ اور دوسری طرف ایشیائی اقوام کے سیاسی زوال اور فکری انحطاط کے اسباب وعلل کا بنظرِ غائر مشاہدہ کر کے یہ محسوس کیا کہ اہلِ مغرب کی تمام تر صنعتی ومعاشی برتری کا راز اُن کا جاندار اور مؤثر نظامِ تعلیم ہے۔ وہ ہندوستان میں تعلیمی پستی اور ذہنی بیداری کے فقدان کا ذمہ دار برطانوی سامراج کے فرسودہ نظامِ تعلیم کو ٹھہراتے تھے۔ جس کے اُصولِ حکمرانی کی بنیادی غرض وغایت اور اولین مقصد بقولِ جان سلیون یہ تھا:۔

"ہمارا طرزِ حکومت اسپنج کے مانند گنگا کے دھارے سے ہندوستان کی دولت چُوستا ہے اور دریائے ٹیمز کے کنارے جا کر نچوڑ دیتا ہے۔" (حکومت خود اختیاری)

خوش قسمتی سے اقبالؒ کی مغرب، اس کے علوم وفنون، اس کی ارتقائی تاریخ اور عہدِ حاضر میں اسے جو عروج حاصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوا ہے، اس پر گہری نظر تھی اور وہ یہ جانتے تھے کہ مغرب سے استعمار اور محکوم قوموں کے استحصال کا جو سیلاب پھوٹا اُس نے ایشیائی اور اسلامی اقوام کو کس طرح تہ آب کیا۔

ماضی کی تاریخ عروج و زوال اس حقیقت کی شاہد ہے کہ نظام تعلیم ہی قومی کردار کی تعمیری اور تخریبی راہیں ہموار کرتا ہے۔ جہاں ایک متحرک اور بامقصد نظام تعلیم قوموں کی ترقی اور خوش حالی کا ضامن ہے۔ اس کے برعکس ایک غلط طرز تعلیم کے نتیجے میں شکست و زوال کے حادثے سے دوچار ہونا اچنبھے کی بات نہیں۔ اس قانونِ فطرت کی روشنی میں آمریت کا نظامِ تعلیم اور ایک آزاد قوم کا طرز تعلیم ہر دو منفی اور مثبت خصوصیات کے حامل ہیں اور جب بھی آمریت اور سامراجیت نے کسی ملک پر تسلط جمایا تو اس ملک کے عوام کو اپنا ہمنوا اور ذہنی غلام بنانے کے لیے دو حربے استعمال کیے۔ انھوں نے یا تو قانون کو ہاتھ میں لے کر تشدد کے ذریعے استبداد کی گرفت مضبوط کی جس کی روشن مثال اطالوی آمر مسولینی کی ذات ہے۔ یا پھر دوسری پالیسی جس پر انگریز گامزن تھے۔ یعنی سامراجی عزائم اور آمرانہ رجحانات کے مطابق محکوم قوموں کے نصابِ تعلیم تبدیل کر کے ذہنی طور پر عوام کو آزادیٔ فکر و نظر سے بے بہرہ اور ذہنی طور پر مفلوج کر کے اپنا ہم خیال اور تابع کر لیا۔ انگریزوں نے پاک و ہند کے عوام کے نصاب تعلیم میں بنیادی تغیر و تبدل کر کے نئی نسل کو اپنی عظیم روایات و ثقافت اور علوم و فنون سے بیگانہ کر کے استعمار کی راہیں ہموار کیں۔

علامہ اقبال مرحوم نہ صرف موجودہ نظام تعلیم سے غیر مطمئن اور نالاں تھے بلکہ وہ نونہالانِ وطن کی خداداد صلاحیتوں اور فطری جبلتوں کی تخلیقی فعلیت کی آزادانہ نشو و ارتقاء کے لیے برصغیر پاک و ہند کے اندر ایک ایسا تعلیمی انقلاب لانے کے خواہاں تھے جو عوام کے ذہن و فکر میں ارتعاش پیدا کر دے۔ اور ان کے ذہن سے احساس کمتری اور فکری جمود کے طلسم کو فلسفۂ خودی کے تخلیقی غور و فکر کی قوتوں سے توڑے۔ حکیم فرزانہ کی چشم بینا یہ نظارہ کر رہی تھی کہ تقریباً دو صدیوں سے برصغیر پاک و ہند میں ایک ایسی نسل فرنگی نظامِ تعلیم کے زیر اثر پروان چڑھ رہی ہے جو رنگ و روغن کے اعتبار سے تو ہندوستانی کہی جا سکتی ہے مگر فرنگی معاشرت اختیار کرنے سے ان کے قلوب و اذہان اور زاویہ ہائے فکر و نگاہ ہر مسئلے پر انگریزی خطوط پر سوچنے کے قائل ہیں ؎

آہ یہ مکتب کا جوانِ گرم خون | ساحرِ افرنگ کا صید زبون

چونکہ مروجہ نظامِ تعلیم برطانیہ کی استعماری ضرورتوں کے پیشِ نظر اور سیاسی مصالح کے تابع مرتب کیا گیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور میکالے کی تعلیمی سازش کے نقطہ نگاہ سے ہندوستان میں ہندوستانی کلرکوں کی ایک ایسی کھیپ تیار کرنا تھی جو اپنے آقا کی وفادار ہونے کے علاوہ اس کے نظمِ مملکت کے امور میں اپنے صاحب کی معاون ہو۔ ارتقائے اس داعی و مبلغ نے دیکھا کہ نوجوان مغربی تہذیب کے کاغذی پیرہن (CARBON COPY) ہونے کے باوجود بھی ان خوبیوں اور صفات سے قطعاً بے بہرہ اور یکسر عاری ہیں جو کہ یورپین اقوام نے اپنے اندر پیدا کر رکھی ہیں لیکن اس کے برعکس ان کے دل و نظر صرف نمائشی تہذیب و ثقافت اور حسنِ کافرانہ سے مرعوب ہو چکے ہیں ۵

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آذرانہ

اگر برصغیر پاک و ہند کی دو سو سالہ تعلیمی ترقی کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہماری انفرادی اور معاشرتی زندگی کی تمام تر خرابیوں کی جڑ یہی نظامِ تعلیم تھا جو انگریزوں نے ہماری خوئے غلامی کو پختہ تر کرنے کے لیے تجویز کیا تھا۔ اسی تاریخی پس منظر میں اقبالؒ کے فلسفۂ تعلیم کو بطریقِ احسن سمجھا جا سکتا ہے۔

تعلیمی ترقّی کی رفتار

۱۸۳۴ء میں جب لارڈ میکالے کو گورنر جنرل کی کونسل میں شامل کیا گیا تو اُس نے اپنی حکومت کو ہندوستان کے نوجوانوں کے اندر بے یقینی اور ذہنی فراریت کے تخریبی اثرات پیدا کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کی:

"انگریزی کی تعلیم حکومت کا ایک مستقل فرض ہے۔ انگریزی ہندوستانیوں کے لیے مغرب کے ترقی یافتہ اور وسعت پذیر علوم کا دروازہ کھول دے گی اور ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان مغربیت کا لبادہ اختیار کر لے گا۔ اس طریقے سے امید ہے کہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہوگا مگر خیالات و تمدن میں انگریز ہوگا۔"

۲۲ مئی ۱۴۹۸ء کو واسکوڈے گاما ایک عرب سیّاح کی رہنمائی میں "راسِ اُمید" کے راستے کالی کٹ پہنچا جس سے یورپی اقوام کی ہند میں آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ فرانسیسی اور برطانوی نوآبادیاتی کشمکش میں بالآخر انگریز کامیاب ہوئے۔ ملکہ وکٹوریہ (۱۸۳۷ء۔۱۹۰۱ء) کی تخت نشینی کی پنجاہ سالہ جوبلی (۱۸۸۷ء) کے وقت تک منجملہ تین ریذیڈنسی یونیورسٹیوں کے کل پانچ یونیورسٹیاں یعنی کلکتہ، بمبئی، مدراس، پنجاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور الہ آباد تھیں - ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۶ء تک ۵۹ سالہ طویل عہد حکومت تک صرف پانچ یونیورسٹیوں کا قیام اہلِ ہند سے افرنگی کے علمی تعصب کی روشن مثال ہے - جن میں سولئے پنجاب یونیورسٹی کے دیسی زبانوں کی تدریس ممنوع تھی - ۹۳-۱۷۹۲ء میں دار العوام نے "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے چارٹر کی تجدید کی اور ولبرفورس نے ہندوستان میں مشنریوں کے بھیجنے کی اہمیت پر زور دیا - اس طرح سے سائنسی وفنی درسگاہیں کھولنے کے بجائے انگریزی زبان اور مشنری ادارے کھول کر عیسائیت کی ترویج واشاعت کا انتظام کیا گیا - ۱۸۱۱ء میں لارڈ منٹو نے ہندوستان کی تعلیمی پسماندگی اور علمی بے مائیگی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے حکومتِ برطانیہ کو ہند میں وسیع پیمانے پر مدارس اور تعلیمی ادارے قائم کرنے کا مشورہ دیا - ۱۸۱۸ء میں بشپ آف کلکتہ نے عیسائی مشنریوں کی تعلیم وتربیت کے لیئے ایک کالج قائم کیا - ہندو اور مسلمان بھی اس میں داخل کیئے گئے اور ان میں انگریزی اور نئے علوم سے زیادہ مذہب عیسوی کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا"[1] اس طرح کلیسائی سازش نے سادہ لوح ہندوستانیوں پر سیاسی جبر وتشدد کے علاوہ ان کے مذہبی عقائد میں بھی دست درازی کی ابتدا کی -

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم ... اک سازش ہے فقط دین ومروت کے خلاف

مسٹر الفنسٹن (۱۷۷۲ء - ۱۸۵۹ء) اور ایف وارڈن نے ۱۸۲۳ء اور ۱۸۲۸ء میں مسئلہ تعلیم پر ایک یادداشت مرتب کی جس میں انہوں نے مندرجہ ذیل حقیقت کا صراحت کے ساتھ اعتراف کیا :-

"ہم نے ہندوستانیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیے ہیں اور ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ تعلیمی ترغیب نہیں ہوتی بلکہ اس سے قوم کا علم سلب ہو جاتا ہے اور علم کے پچھلے ذخیرے نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں"

اس کے ساتھ ہی ۱۸۳۰ء میں "لندن مشنری سوسائٹی" نے یہ فخریہ اعلان کیا کہ "اگر اسکولوں میں مذہبی تعلیم نہ بھی ہو تب بھی انگریزی تعلیم سے خود بخود عیسائیت پھیلے گی"[2] - ۱۰ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو ایک قرارداد کے ذریعے پہلی بار اسامیوں کے لیئے سرکاری درسگاہوں کے تعلیم یافتہ امیدواروں کو ترجیح دینے کا فیصلہ ہوا - بقول لارڈ الفنسٹن "کالجوں میں ایسے لوگوں کی کھیپ تیار کی جائے جو ذہن واخلاق کے اعتبار سے ہندوستان میں برطانیہ کی" سول ایڈمنسٹریشن" میں ملازمت کی اہل ہو - ۱۸۵۴ء میں مجلسِ تعلیماتِ عامہ نے پہلی بار نظامِ تعلیم کی تشکیل وتدوین کی - جس میں ورنیکولر ثانوی وابتدائی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی گئی -

---

[1] INDIAN MUSLIMS — RAM GOPAL, P.19 [2] ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں - عابد حسین صفحہ ۳۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعد ازاں مراسلہ ۱۸۵۹ء میں ۱۸۵۴ء کی تعلیمی منصوبہ بندی کی حمایت کی گئی۔ ۱۸۷۱ء میں نظامتِ تعلیم کی نگرانی لوکل گورنمنٹوں کو تفویض کی گئی۔ ۱۸۷۵ء میں سرسید نے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج (M.A.O COLLEGE) کا سنگِ بنیاد رکھا اور دس سال بعد ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جس نے تعلیمی اصلاحات کے لیئے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ۱۸۸۴ء میں مسئلہ تعلیم پر ایک گورنمنٹ ریزولیوشن میں کمیشن کی سفارشات کی توسیع و اصلاح کی تجویز زیرِ غور آئی۔ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے یونیورسٹی کمیشن قائم کیا۔ ۱۹۰۴ء میں یونیورسٹیز ایکٹ کی تعلیمی پالیسی میں صنعتی و فنی تعلیم پر برائے نام توجہ دینے کے لیئے مرکزی حکومت میں پہلی بار محکمۂ تعلیم کا اضافہ ہوا۔ جنوری ۱۹۱۲ء میں ملک معظم نے کلکتہ یونیورسٹی کے سپاسنامے کے جواب میں تعلیم عام کرنے کی سفارش کی۔ تعلیمی ریزولیوشن گورنمنٹ ہند مجریہ ۱۹۱۳ء کو بعض مالی و انتظامی دشواریوں کی بنا پر ناکامی کا سامنا ہوا اور ۱۹۲۰ء میں سرسید مرحوم کا دیرینہ خواب علیگڑھ یونیورسٹی کے پیکر میں شرمندۂ تعبیر ہوا اس مادرِ علمی کی آغوش میں مسلم طلبہ کی ایک بڑی جماعت علوم و فنون کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو کر تصویرِ اقبال کے خاکے میں قوسِ قزح کا رنگ بھرنے کیلئے میدانِ عمل میں آئی۔ اس تاریخی پس منظر کی روشنی میں اقبال ایسے دقیق النظر مفکر کے فکر و فن پر جامع اور ہمہ گیر بحث کرتے ہوئے بعض اربابِ فکر و نظر کی غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے جن سے اقبال کے انقلابی نظریۂ تعلیم میں ابہام پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ آج کا ایک ترقی پسند اور روشن خیال مفکرین کا گروہ جو ترقی پسندی میں بورژوائی طبقے کا بہروپ ہے۔ صرف یہ نہیں کہ اقبال کے تعلیمی افکار کو ہدفِ تنقید بنا رہا ہے بلکہ عصرِ جدید کے یہ اصحاب فکر و فن اقبال کو بحیثیتِ فلسفی تسلیم کرنے میں بھی مخلص نہیں۔ اقبال کے نظریات و افکار کو مغربی مفکرین کی خوشہ چینی قرار دینا درحقیقت یہ مفروضہ ان کی علمی بے چارگی اور وسیع مطالعے کے فقدان کا نتیجہ ہے جنہوں نے نہ تو اس صاحبِ آفاق و محرمِ اعماق کی فلسفیانہ موشگافیوں کو نہ مغربی دانشوروں کے افکار و تخیلات کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ کیا ہے، دوسری طرف روایت اور رجعت پسند ناقدین کا ایک مکتبِ فکر ان کی شاعرانہ رفعت و عظمت کو محض اس وجہ سے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور انھیں بحیثیت فن کار نیز زبان کے بارے میں سند ماننے سے اس لیئے منحرف ہے کہ اقبال نے بعض جگہ شعر کے فنی لوازم اور قدیم عروضی روایات سے بغاوت کی ہے۔ یہ حلقہ اثر "ادب برائے ادب" کا سختی سے قائل ہے۔ اس بارے میں اقبال نے جو وضاحت فرمائی ہے، وہ یہ ہے :-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس! اس بات کو مدِ نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ آرٹ (فن) غائیت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے۔ اور یہ بات موجودہ وقت میں میرے لئے ممکن نہیں۔"[1]

اقبال کا یہی ارتقائی وحرکی (dynamic) نظریہ ہے، جو ادب برائے زندگی کی اپیل کرتا ہے۔ ان معترضات کی یہ حد سے بڑھی ہوئی غیروں کی فکری مرعوبیت اور ذہنی محکومیت قابلِ رحم ہے۔ دراصل وہ تعصب کے پردے میں اقبال کے پروازِ فکر کے شاہین کو اپنی عنکبوتی کمند کے زیرِ دام دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ حقیقت میں اقبال کے فلسفیانہ افکار نہ تو ہم عصر اور پیش رو جرمن مفکرین "گوئٹے" (۱۷۴۹ء۔۱۸۳۲ء) و "ہیگل" (۱۷۷۰ء۔ ۱۸۳۱ء) "فشٹے" (۱۷۶۲ء۔۱۸۱۴ء) اور "نٹشے" (۱۸۴۴ء تا ۱۹۰۰ء) کے افکار و نظریات کا سرقہ ہیں اور نہ شہرۂ آفاق فرانسیسی مفکر "برگسان" (۱۷۶۲ء۔ ۱۸۲۱ء) اطالوی دانشور "ڈانتے" (۱۲۶۵ء تا ۱۳۲۱ء) اور نامور امریکی ماہر نفسیات "میکڈوگل" (۱۸۷۱ء۔ ۱۹۳۸ء) کے فلسفیانہ تصورات کا چربہ ہیں۔ اقبال نے انہیں اپنا ذہنی و فکری مرشد تسلیم کرنے سے محض انکار نہیں کیا بلکہ جملہ مستشرقین کے متصادم و متضاد نظریات پر کڑی تنقید اور محاسبہ بھی کیا ہے۔

مثال کے طور پر وہ ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں کیا انسانِ کامل سے متعلق میرے خیالات جرمن فلاسفر نٹشے کے نظریۂ "فوق البشر" کا پرتو ہیں؟ علامہ نے اس خیال کی تردید کی اور لکھا کہ "بعض انگریز ناقدین نے اس سطحی تشابہ و تماثل سے جو میرے اور نٹشے کے خیالات میں پائے جاتے ہیں، دھوکہ کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں۔ "دی ایتھینیم" والے مضمون کا تبصرہ نگار انسانِ کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خلط مبحث کرکے "انسانِ کامل" اور جرمن مفکر کے "فوق الانسان" کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسان کے متصوفانہ عقیدے سے متعلق قلم اٹھایا تھا اور اس وقت تک نٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک نہ پہنچا تھا اور نہ اس کی کتابیں میری نظر سے گذری تھیں۔"

---

[1] اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۱۰۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک دوسری جگہ وہ جرمنی کے مایۂ ناز مفکر ہیگل کے نظریۂ تصورِ حیات و کائنات اور انسان سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں " یہ نظریۂ ہیگل اور اس کے انگریز ہم خیالوں اور اربابِ وحدت الوجود سے مختلف ہے جس کے خیال میں انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ خدا یا حیاتِ کُل میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی ہستی مٹا دے " میری رائے میں انسان کا مذہبی اور اخلاقی منتہائے مقصود یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے یا اپنی خودی کو فنا کر دے [1]

بعض مغرب زدہ ائمہ فکر و فن ان کے عقیدۂ واقعیت زمان کے تصور کو برگساں کے جوشش حیات اور ارتقائے تخلیقی کا عکس بتاتے ہیں۔ برگساں نے نفسِ انسانی کی تخلیقی صلاحیت کو مادی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے لیکن اقبال کے نزدیک نفسِ انسانی کا محرک روحانی جذبہ ہوتا ہے ۱۹۳۱ء میں جب اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت سے واپسی پر پروفیسر برگسان سے ملے جس کے نظریۂ " واقعیت زمان " کو وہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے زیادہ قریب سمجھتے تھے۔ دورانِ ملاقات اس نظریۂ پر دقیق فلسفیانہ بحث ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے برگساں کو جب یہ حدیث سنائی کہ زمانہ کو برا مت کہو کہ زمانہ خدا ہے " برگساں یہ سن کر اچھل کر آگے بڑھا اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کیا یہ سچ ہے [2] آیئے اب مشاہیر کے پُرمغز دلائل کی روشنی میں اقبال کی فلسفیانہ عظمت کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کریں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری جنہوں نے انگریزی میں اقبال کی مثنویوں (اسرار و رموز) پر ایک مبسوط تبصرہ کیا ہے لکھتے ہیں " کیا اقبال نیٹشے کے زیر اثر تھا ؟ میرا جواب اثبات میں ہے۔ وہ ہمیشہ مستعار چیز کو جلا دے کر ایک نئی اور انوکھی چیز بنا لیتا ہے۔ مثال کے طور پر " اسرار خودی " کی حکایت " الماس و زغال " کو لے لیجئے جو نیٹشے کی تصنیف (ارشادات زردشت) کی ایک حکایت (پتھر اور کوئلہ) سے ماخوذ ہے۔ مگر اقبال " نیٹشے " سے بزرگ تر شاعر ہے اس نے پتھر کو اس طرح کاٹا اور صیقل کیا ہے کہ الماس اس کا اپنا بن گیا "، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے بھی اقبال پر حکمائے یورپ کے اثرات کی وضاحت کی ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ " جہاں تک افکار کا تعلق ہے، انہوں نے نہ رومی کا کامل تتبع کیا ہے نہ " نیٹشے " کا نہ برگسان کا نہ کارل مارکس، نہ لینن کا " اپنے تصورات کا قالین بنتے ہوئے انہوں نے رنگین دھاگے اور بعض خاکے ان لوگوں سے لئے ہیں۔ لیکن ان کا مکمل قالین کا نقشہ کسی دوسرے کی ہو بہو نقل نہیں

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۸۵ [2] اقبال کامل ص ۲۷ [3] مترجمہ مالک رام، نیرنگِ خیال اقبال نمبر ۱۳۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے" امریکی فاضل ڈاکٹر اسپرینگلنگ (SPRENGLING) شکاگو کے رسالہ (CHRISTENDOM 1936) میں اقبال کے خطبات "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" پر ایک مضمون میں اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں "سر محمد اقبال فی الحقیقت نہائیت بلند پایہ مفکر اور مذہبی فلاسفر ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کا فلسفہ بیش بہا جواہرات کی کان ہے۔ چونکہ وہ مسلمان ہیں اسی وجہ سے ارباب مغرب کیلئے ان کے حقیقی مقام رفیع کو دریافت کرنا آسان نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ٹیگور یا گاندھی"...... سب سے زیادہ قابل توجہ شخصیت ڈاکٹر اقبال ہے جو موجودہ زمانہ کے بہترین مسلمان ہیں اور ہر لحاظ سے مغرب کے بڑے سے بڑے فلسفی کے ہم پلّہ ہیں"۔

اقبال کا فلسفۂ تعلیم

اقبال کے نزدیک تحصیل علم کا کیا مقصد ہے۔ تعلیمی پالیسی کی تشکیل کن خطوط اور حدود کو مدنظر رکھ کر کی جائے، تعلیم کے بنیادی اغراض و مقاصد اور مکتب کے ماحول نیز اساتذہ کی ذمہ داریاں کس نوعیت کی ہونی چاہئیں، فعال اور با مقصد نظام تعلیم میں کن مضامین کو فوقیت دی جائے نیز اقبال نے عملی طور پر اس کے لئے کیا کچھ کیا۔ اگر ان تمام تعلیمی مسائل کا حل اقبال کے افکار کی روشنی میں دیا جانا ممکن ہے تو ہمارے پاس اقبال کو ایک ماہر تعلیم اور ایک ماہر فلسفی ادیب تسلیم نہ کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اقبال چونکہ خود بھی چار پانچ سال شعبۂ تعلیم سے وابستہ رہے۔ انہوں نے درسگاہوں کے فرسودہ طریق تدریس، دوران کار نصاب کی متعین حدود اور ارباب مدرسہ کی نظری و فکری بے مائگی ان تمام خامیوں کو محسوس کرتے ہوئے نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت کا احساس کیا۔ اقبال کے فلسفۂ تعلیم کا حقیقی اور اصل مقصد کسی شے کا علم کی روشنی میں تجزیہ و مشاہدہ کر کے حقائق و معارف اور اسرار و رموز کا محض سراغ لگانا ہی نہیں بلکہ اس سے مرتب شدہ نتائج کو معجزانہ امتزاج کے ساتھ انسانیت کی تعمیر و ارتقاء کیلئے صرف کرنا ہے۔ وہ اپنے فلسفۂ تعلیم کا سنگِ بنیاد قرآن حکیم کو سمجھتے ہیں کیونکہ مسلمان کے بنیادی فلسفۂ زندگی کو قرآنی تعلیمات ہی سے رہنمائی اور روشنی ودیعت کی گئی لہٰذا وہ ایک جامع اور ہمہ گیر نصاب تعلیم کے اصول و مبادی اور جزئیات کو مفید اور مؤثر بنانے کے لئے اسی دستور حیات کی طرف رجوع کرتے ہیں جہاں وہ علم کے لئے عقل و عشق کے متناسب ربط و اتصال کو ضروری سمجھتے ہیں وہاں وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہبی فکر یعنی الہام و وجدان کو بھی حصولِ علم کا منبع تصور کرتے ہیں۔ عقل و عشق اور جنون و وجدان کی اصطلاحیں ان کے ہاں غیر مبہم نہیں ہیں۔ عشق سے مراد جذبۂ تسخیر، تخلیقی شعور اور جذبۂ ارتقا کا متناسب امتزاج ہے اور عقل کے دائرۂ عمل کی وضاحت خود اس طرح کرتے ہیں۔ عقل کو کسی حقیقت تک پہنچنے کے لئے خون کے دریا عبور کرنے پڑتے ہیں۔ آگ کی خندقوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ عقل بعد از خرابیٔ بسیار حقیقت تک پہنچتی ہے۔ علامہ کے شعر و ادب اور فکر و فن کا مرکز و محور یوں تو فلسفۂ خودی ہے۔ لیکن تعلیم کے بارے میں وہ اس پر زیادہ زور دیتے ہوئے تعلیم کا مقصد ہی خودی کی تکمیل سمجھتے ہیں۔

خودی کے اندر کارفرما انقلابی روح طلبہ کو محض وسعتِ نگاہ اور ذوقِ جستجو کے جذبے سے ہی سرشار نہیں کرتی بلکہ گہری بصیرت اور تحقیقی غور و فکر کی لذتوں سے بھی ہمکنار کرتی ہے اور پیچیدہ تہذیبی مسائل کی گہرائی و گیرائی کی وسعتوں کی گرہ کشائی کرنے میں فعال کردار ادا کرتی ہے۔ حکیم امت کے نزدیک تعلیم کا منشائے حقیقی یہی ہے۔ وجدان جسے وہ حصولِ علم کا ایک اہم وسیلہ قرار دیتے ہیں وہ اس کا استعمال وسیع مقاصد کے مفہوم میں کرتے ہیں۔ ادراک، شعور اور الہام کے تناسب اور ہم آہنگی سے ہی وجدانی فہم و ادراک پیدا ہوتا ہے۔ احساس و مشاہدہ اور حقائق کا سراغ لگانا ادراک کا فرض ہے۔ الہام یا عشق حقائق کو براہِ راست احساسِ قلب سے ہی قبول کرنے کا نام ہے ؎

نہ مکتب چشم و دل نتواں گرفتن
کہ مکتب نیست جز سحر و فسونے

مسلمان کی مذہبی فکر کا بنیادی پتھر وہ ان کے مذہبی شعور کو تصور کرتے ہیں جو انہوں نے قرآن سے اخذ کیا ہے۔ ان کے نزدیک مذہبی شعور نہ تو وہ اندھا عقیدہ ہے جو کسی ازغانی اصول کو بے چون و چرا قبول کر لے اور نہ خالص ذہنی تحقیق و جستجو ہے جو بحث و استدلال سے پیدا کیا جا سکے۔ بلکہ یہ خاص کیفیت اور جذبہ اس وقت جنم لیتا ہے جب انسانی وجدان گہری بصیرت اور عقلی ادراک کے ایک متحدہ عمل کے ذریعے اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد اس وقت تک ادھورا ہے، جب تک انسانی زندگی کے خارجی و داخلی دونوں گوشوں میں سے کسی ایک میں بھی کجی یا تشنگی باقی ہے دوسرے لفظوں میں وہ عارضی مادی زندگی اور ابدی روحانی زندگی دونوں کو برابر اہمیت دیتے ہیں ؎

علم از سامانِ حفظِ زندگی است
علم از اسبابِ تقویمِ خودی است

انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے کے صدارتی خطبہ میں انہوں نے اس امر کی وضاحت کی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"تجربہ بتاتا ہے کہ جدید تعلیم نے مسلمان نوجوانوں کے اخلاق و کردار پر کوئی خاص اثر نہیں کیا اور یہ امر ظاہر ہے کہ ایک مسلمان نوجوان کی تعلیم کی اساس اگر ذہنی اور اخلاقی نہ ہو تو اُس میں سیر چشمی، بلند نظری اور خود داری کے وہ اوصاف حسنہ نہیں پیدا ہو سکتے جو اسلامی سیرت کے مابہ الامتیاز ہیں"[1]

علم کا شجر ارتقاء حریت افکار کی زرخیزی اور آزادیٔ فکر و عمل کی فراوانی سے بالیدگی اور توانائی حاصل کرتا ہے۔ آزادیٔ فکر و نظر کے شعلہ سے آرزوؤں اور تمناؤں کے چراغ روشن ہوتے ہیں جس سے آزادیٔ عمل کی شاہراہوں پر تلاش و جستجو کے دیپ ذوقِ تنویر پاتے ہیں۔ تاکہ اسرارِ حیات کی نیلگوں فضاؤں میں رازہائے سربستہ کا کھوج اور سراغ لگا سکیں۔

فطرت نے چونکہ مسلمان کی شخصیت کو تاریخ ساز اور اس کے مزاج کو تخلیقی جذبے سے سرشار کر کے جذبات و افکار کی تازہ انقلابی روح پھونکی ہے۔ اس پر یہ لازم ہے کہ کائنات و آثارِ فطرت سے متعلق تجزیہ و تحلیل کر کے اس جہانِ آب و گل میں انقلاب بپا کر دے۔ اس کی ہر کروٹ سے فکر و فن کے سوتے پھوٹیں اور اس کے آئینہ قلب میں تحقیق و تخلیق کا اضطراب جنم لے۔ وہ سائنس اور مذہب یا عقل و دین کو دو متخالف اور متحارب قوتیں نہیں خیال کرتے بلکہ سائنس کو کُل (مذہب) کا ایک عضو قرار دیتے ہیں" لہٰذا دین کے لئے حقیقت کے جزئی علم (سائنس) سے گھبرانے کی قطعاً کوئی وجہ نہیں۔ دین جو حقیقت کا من حیث الکُل مطالعہ کرتا ہے۔ نہ محض فکر ہے، نہ محض احساس، نہ محض عمل بلکہ انسان کی ذات کا کلی مظہر ہے" (خطبات) اسی طرح مذہب، سائنس کو تحقیق و تجسس کے نئے نئے پہلوؤں کی طرف دعوتِ مشاہدہ دیتا ہے۔

۱۳ مارچ ۱۹۲۷ء کو اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں سائنس و مذہب کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا۔

"مذہب، فلسفہ، طبعیات اور دیگر علوم و فنون سب کے سب راستے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں کیونکہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنونِ حاضرہ کے باب کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں اور اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسات پر رکھنے کے طریق کو مسترد کرنے کی تعلیم دی اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوئی" (باقی)

---

[1] مقالاتِ اقبال ص ۲۱۳

© rasailojaraid.com